اداریہ:

عہد حاضر اور ہم

سلام اس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے سلام اس پر کہ جس نے خون کے پیاسوں کو قبائیں دیں سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں سلام اس پر شکستیں جس نے دیں باطل کی فوجوں کو سلام اس پر کہ ساکن کردیا طوفاں کی موجوں کو سلام اس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے سنا سکتے ہیں اب بھی خالدؓ و حیدرؓ کے افسانے

۳۴ مغربی ممالک کے چالیس اخبارات میں شائع ہونے والے پیغمبر اسلام ﷺ کے توہین آمیز اور اشتعال انگیز کارٹونوں نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کو مشتعل اور غضب ناک کردیا ہے۔ متعلقہ اخبارات کے مدیران آزادی اظہار کو اس ناپاک جسارت کا جواز قرار دیتے ہیں، جبکہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کوفی عنان کے خیال میں یہ فعل ''جلتی پر تیل'' انڈیلنے کے مترادف ہے۔ مذکورہ کارٹون ڈنمارک کے روزنامہ ''جلینڈ پوسٹز'' میں شائع ہوئے۔ مبینہ طور پر اس اخبار کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ''حساب برابر'' کرنے کے لئے جتنی تعداد میں رسول خدا کے کارٹون چھاپے گئے، اتنی ہی تعداد میں حضرت عیسیٰ کے کارٹون چھاپے جائیں گے۔ ان کارٹونوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تضحیک کا پہلو نمایاں ہوگا۔ یہ (حل یا طریقہ معذرت) مسلمانوں کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ کو بھی خدا کا پیغمبر اور نبی مانتے ہیں۔

آزادئ اظہار رائے کا حق لامحدود ہرگز نہیں اور شہری و سیاسی حقوق پر عالمی قانون (International Covenant on Civil and Political Rights-ICCPR) کے ذریعے اس حق کو محدود کیا گیا ہے۔ امن عامہ اور اخلاقی اقدار کو برقرار رکھنے کے لئے مذکورہ معاہدے کا احترام ضروری ہے۔ ان توہین آمیز کارٹونوں کو دیکھ کر کسی بھی مسلمان کے غم و غصے کا عروج پر پہنچ جانا فطری سی بات ہے۔ دنیا کارٹونوں کی اس بات

کو ''تہذیبوں کے تصادم'' (Clash of Civilisations) کا تمہیدی منظر قرار دے رہی ہے، یعنی ''مغرب بمقابلہ اسلام'' کے دور کا (ایک بار پھر) آغاز ہو چکا ہے۔

امریکہ کے انڈر سیکریٹری آف اسٹیٹ فار پبلک ڈپلومیسی، کیرن ہغز (Karen Houghes)، جو ان دنوں دوسری مرتبہ مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر ہیں، یقیناً اس بات پر کسی حد تک اطمینان محسوس کر رہی ہوں گی کہ گزشتہ دو ہفتے سے مسلم دنیا میں جس غم و غصے کے اظہار کیا جا رہا ہے، اس کا نشانہ بنیادی طور پر یورپ ہے نہ کے امریکہ، اس مسئلے کو ''کارٹون بحران'' کا نام دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ کارٹون کا نہیں ناموس رسالت کا مسئلہ ہے۔

ہغز نے جو کہ صدر جارج بش کی پرانی دوست اور مشیر ہیں، موجودہ بحران کے حوالے سے امریکی موقف اور ردِ عمل کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ بحران بہت بڑے پیمانے پر احتجاج کا اور بعض مقامات پر، خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ میں تشدد کا محرک بن چکا ہے۔

بلاشبہ انھیں قطر میں ہونے والے سالانہ اسلامک ورلڈ فورم میں امریکی نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے مدعو کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں وہ متحدہ عرب امارات میں مختلف این جی اوز اور طلبہ کے ساتھ اپنی طے شدہ ملاقاتوں میں بھی امریکی موقف کو واضح کریں گی۔ ان کی رہنمائی میں امریکی انتظامیہ نے ایک نہایت محتاط موقف اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ایک طرف مسلمانوں کے ساتھ ہم دردی کا اظہار کیا گیا ہے جو ڈنمارک اور بعد ازاں یورپ کے دوسرے بڑے اخبارات میں شائع ہونے والے پیغمبر اسلام کے توہین آمیز خاکوں پر سخت غم زدہ ہیں اور دوسری طرف آزادی اظہار کے اصول کا بھی دفاع کیا گیا ہے۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ترجمان اسکاٹ مکارمک (Scott McCormick) نے بحران کے آغاز میں یہ بیان دے دیا تھا کہ ''اسلام کے خلاف بنائے جانے والے خاکے بھی اسی طرح ناقابل قبول ہیں، جس طرح یہودی، مسیحی یا کسی بھی دوسرے مذہبی عقیدے کے خلاف''۔ ''اگرچہ ہم ان خاکوں سے مسلمانوں کو پہنچنے والے دکھ میں ان کے ساتھ شریک ہیں، لیکن ہم آزادی رائے اور آزادی اظہار کے حق کی بھی اسی طرح پوری قوت سے حمایت کرتے

ہیں"۔ تاہم اس محتاط اور متوازن بیان نے امریکی انتظامیہ کے بعض مضبوط ترین حامیوں، خاص طور پر نوقدامت پسندوں اور بعض دوسرے "عقابوں" کو ناراض کر دیا، جنھوں نے الزام لگایا کہ اس موقف سے "اسلامی انتہا پسندوں" کو "مطمئن کرنے" کا رویہ جھلکتا ہے جو کہ مغرب کے آزادی اظہار کے ان تصورات کو خیر باد کہنے کے مترادف ہے جن کے دفاع کے لئے بش نے مزعومہ طور پر "دہشت گردی کے خلاف" جنگ چھیڑی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی انتظامیہ کی طرف سے اگلے بیانات میں، خاص طور پر دمشق اور بیروت میں ڈنمارک کے سفارت خانوں پر حملوں کے بعد، کارٹونوں کی قابل اعتراض نوعیت کی بہ نسبت تشدد کی مذمت پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ صدر بش نے اعلان کیا کہ "آزاد پریس میں جو کچھ چھپا ہے، اس پر عدم اطمینان کے اظہار کے لئے تشدد کا طریقہ اختیار کرنا قابل مذمت ہے"۔

نائب صدر ڈک چینی کا پسندیدہ کالم نگار وکٹر ڈیوس ہینسن (Victor Davis Hanson) اپنے حالیہ کالم میں لکھتا ہے کہ "۱۹۳۰ء کے دکھ کا مداوا کرنے کی کوششوں (Appeasment) کی طرح، اس وقت بھی ہم ایک ایسے عظیم دور میں ہیں جس میں اخلاقی جکڑبندیوں کو محدود تر کر دیا گیا ہے۔ اگر ہم نے ان آٹھویں صدی کے ملاؤں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تو بہت جلد ہم خود بھی آٹھویں صدی میں رہ رہے ہوں گے جہاں ہم کوئی ایسی بات نہ کہہ سکیں گے، نہ سن سکیں گے اور نہ کر سکیں گے جس سے ایک بنیاد پرست مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہو"۔

نوقدامت پسند ہفت روزہ "سٹینڈرڈ" (جو ان چند امریکی اخبارات میں سے ہے جنھوں نے خاکوں کو دوبارہ شائع کیا) کے مدیر ولیم کرسٹول (William Kristol) لکھتا ہے کہ "اسلامی انتہا پسندی کے خلاف عالمی جدوجہد میں یہ سچ کا ایک لمحہ ہے"۔ وہ لکھتا ہے کہ ڈنمارک کے خلاف احتجاجی مظاہرے ثابت کرتے ہیں کہ "وہ لوگ جو ہمارے مشرق وسطیٰ کو "آزاد اور مہذب بنانے" کی کوششوں سے خوفزدہ ہیں، جوابی حملہ کر رہے ہیں اور اس کے لئے ہر وہ ہتھیار استعمال کر رہے ہیں جو ان کے بس میں ہے"۔

جناب آغا شاہی صاحب لکھتے ہیں زیر بحث کارٹون پیغمبر اسلام سے یا دوسرے

لفظوں میں اسلام سے نفرت کا اظہار ہیں۔ان کارٹونوں کو شائع کر کے ''ہمہ قسم کے نسلی امتیاز (تعصبات) کے خاتمے پر عالمی کنونشن'' کی صریحاً خلاف ورزی کی گئی ہے۔ یہ کنونشن نسلی برتری،نفرت انگیز تقاریر اور نسلی تعصب کو ابھارنے کے عمل کو غیر قانونی قرار دیتا ہے۔اس کی رو سے اقوام متحدہ کی ہر رکن ریاست پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کے قابل تعزیر اقدامات کے ذمہ داروں کو قرار واقعی سزا دے۔لہٰذا یہ ثابت ہو گیا کہ ان کارٹونوں کو شاوع کر کے دراصل ایک عالمی قانون کی نفی اور خلاف ورزی کی گئی ہے۔آزادی اظہار کی آڑ میں عقیدہ اسلام کے حاملین یعنی مسلمانوں کے جذبات کو جس طرح مجروح کیا گیا ہے۔جناب آغاز شاہی سابق وزیر خارجہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس کے بعد ضروری ہو گیا ہے ان ملکوں میں موجود اسلامی تنظیمیں اور مسلمان قانونی ماہرین متعلقہ ملکوں کی بااختیار عدالتوں سے ''محکم فیصلہ'' (Ruling) حاصل کریں بلکہ ترجیحاً ''انسانی حقوق کی یورپی عدالت'' (European Court of Human Rights) سے رابطہ کریں تا کہ مسلمانوں کے زخموں کا کسی حد تک مداوا ہو سکے۔

CCPR اور ICERD جیسے معاہدوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ آزادی اظہار رائے کا مطلب بے لگام آزادی ہرگز نہیں،اس کی حدود و قیود کا باقاعدہ تعین کیا گیا ہے۔ان معاہدوں پر اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی واضح اکثریت نے دستخط کر رکھے ہیں اور یورپی عدالتیں ان حدود و قیود کی توثیق کرتی ہیں۔ICERD پر عمل درآمد کا جائزہ لینے اور اسے مانیٹر کرنے کے لئے باقاعدہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو ''نسلی تعصبات کے خاتمے کی کمیٹی'' کے نام سے موسوم ہے۔قانون کی رو سے نسلی برتری یا نسلی تعصب یا نسلی برتری کے نام پر نفرت پھیلانے کو مستوجب سزا قرار دیا گیا ہے۔نسلی تفاخر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نسلی منافرت تشدد کو جنم دیتی ہے،لہٰذا یہ فعل قانوناً ممنوع ہے اور اس کی سزا اظہار رائے کی آزادی سے ہم آہنگ ہے۔اس حوالے سے صرف موزوں اور مناسب قانون سازی ہی کافی نہیں، بلکہ قانون کا موثر نفاذ بھی ضروری ہے۔جو شہری آزادی اظہار کے حق سے استفادہ کرتے ہیں،ان پر بعض خصوصی فرائض اور ذمہ داریاں (خود بخود) جاری ہو جاتی ہیں۔(CERD کی عمومی

سفارش xv)

اسلامی عقائد کے حامل افراد (مسلمان) جن کی توہین کی گئی ہے، وہ گوروں کے اس طبقے سے مختلف طبقہ ہیں جس نے توہین کا آغاز کیا یا جو توہین کے ذمہ دار ہیں، جسے ICERD اور CERD جرم قرار دیتے ہیں۔ شہریوں کو جو بنیادی آزادیاں اور انسانی حقوق ICCPR کے توسط سے حاصل ہیں، ''انسانی حقوق کی کمیٹی'' ان سے متعلقہ قوانین کی مفصل اور سیر حاصل توجیہ و توضیح کرتی ہے۔ اس کمیٹی نے ''فاریسن بنام فرانس'' کیس میں دیے جانے والے عدالتی فیصلے کی توثیق کی تھی۔ اس عدالتی فیصلے کے تحت ''یہودی مخالف کی دل جوئی اور انہیں سہارا دینے کے لئے ضروری ہے کہ ایسے بیانات کے اجرا پر پابندی عائد کر دی جائے جو یہود مخالف ہوں یا جن سے یہودیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو۔ اس طرح یہودیوں کو مذہبی منافرت کی دفعہ (۲) ۲۰ کے پس منظر میں کارفرما اصول بھی مذکورہ پابندی کی حمایت کرتا ہے۔ آزادی اظہار کے حق سے استفادہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بعض فرائض اور ذمہ داریاں اپنے ذمہ لے لی جائیں''۔

''انسانی حقوق کی کمیٹی'' (HRC) نتیجہ اخذ کر چکی ہے کہ اس نوعیت کی پابندی ICCPR کی دفعہ ۱۹ کی خلاف ورزی نہیں کرتی۔ سوال یہ ہے کہ یورپی عدالتیں یہودیوں کو تو حق دیتی ہیں کہ ان کے خلاف بیانات جاری نہ کئے جائیں اور بڑے پرجوش انداز میں یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے پھر مسلمانوں کو یہ حق دینے میں لیت و لعل سے کیوں کام لیا جاتا ہے؟ ''انسانی حقوق کی عالمی عدالت'' کے فیصلوں پر نظر ڈالی جائے تو مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

''اظہار رائے کی آزادی کا اطلاق ان معلومات و نظریات پر بھی برابر ہوتا ہے، جو ریاست میں انتشار یا عوام کے کسی طبقے میں اشتعال کا سبب بن سکتے ہوں، اجتماعیت اور برداشت کے یہی تقاضے ہیں، جن کے بغیر کسی معاشرے کو جمہوری معاشرہ نہیں کہا جا سکتا''۔

ڈائی چنڈ و دیگر بنام آسٹریا، کرتاس بنام ترکی، بیلڈٹ ٹرامز بنام ناروے جیسے

مقدمات میں یورپی عدالتوں نے صحافیوں کو اشتعال انگیز حد تک مبالغے کی اجازت دے دی، تاہم ایک یورپی عدالت نے ''دنگرو و بنام برطانیہ'' نام کے مقدمے میں مذکورہ بالا مقدمات کے فیصلوں سے مختلف فیصلہ بھی دیا جس کے تحت ''جب دفعہ (۲) ۱۰ کے تحت سیاسی تقاریر اور قابل اعتراض و متنازعہ سیاسی مباحث پر پابندی عائد نہ کی جاسکے تو عوامی مفاد کے پیش نظر آزادی اظہار کے حق کو محدود کیا جاسکتا ہے، بالخصوص جو مباحث ذاتی، اخلاقی یا مذہبی عقائد سے متعلق ہوں''۔

''اوٹو پریمنگر انسٹی ٹیوٹ بنام آسٹریا'' نام کے مقدمے میں بھی اسی اصول کی پیروی کرتے ہوئے عدالت نے لکھا کہ ''دفعہ ۹ کے تحت مذہبی جذبات کے احترام کی جو ضمانت فراہم کی گئی ہے، اس کے مطابق کسی بھی مذہب کی توہین پر مبنی اشتعال انگیز بیانات کو بدنیتی اور مجرمانہ خلاف ورزی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جمہوری معاشرے کے اوصاف میں یہ وصف بھی شامل ہے کہ اس نوعیت کے بیانات، اقوام یا افعال کو تحمل برداری اور برداشت کی روح کے منافی خیال کیا جائے اور دوسروں کے مذہبی عقائد کے احترام کو صدفی صد یقینی بنایا جائے۔

اگر کوئی کسی دوسرے کے مذہبی عقائد کی مخالفت کرے یا انہیں جھٹلائے تو عدالت ان پر پابندی عائد کرسکتی ہے کہ وہ ممنہ حد تک ایسی گفتگو سے پرہیز کرے جو کسی دوسرے عقیدے یا مذہب کے ماننے والے کی دل آزاری کا باعث بنتی ہو۔ ''ڈیوبوسکا اور سکپ بنام پولینڈ ۴۰'' کیس میں اسی سوچ کو عملی جامعہ پہناتے ہوئے عدالت نے لکھا کہ:

''جن باتوں کو مذہب یا عقیدے کی رو سے مقدس یا قابل تعظیم سمجھا جاتا ہو، ان کی متشدد اور اشتعال انگیز تصویر کشی کو دفعہ ۹ کے تحت حاصل شدہ حقوق کی نفی اور خلاف ورزی سمجھا جائے گا۔ حکومت کا مثبت فرض یا مثبت ذمہ داری ہے کہ اقلیتوں کے پختہ مذہبی عقائد کے تحفظ کا اہتمام کرے اور انہیں ہر قسم کے حملوں سے بچائے۔ قانون کے تحت حاصل شدہ کسی بھی مذہبی حق کا استعمال، اگر کسی فرد کے عقائد کی توہین کرتا ہو تو اس کی حدود کا تعین کرنے کے لئے ریاست کی مداخلت جائز ہوگی۔۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ شہریوں کے باہمی تعلقات میں

مذہبی عقائد کی آزادی کے حق کے احترام کو بھی یقینی بنائے عوام اور ریاستی حکام کے باہمی مراسم کے تناظر میں بھی آزادی مذہب کے حق کو محترم جانے۔ اس ریاستی فرض کا ادراک برطانیہ میں اقلیتوں کے مذاہب کے فروغ میں (یورپی) کنونشن کو مہمد بنا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ فروغ کے عمل میں (یورپی) کنونشن کو اہم کردار سونپا جاسکتا ہے''۔ (دی اوٹو پریمنگر کیس)

(بشکریہ ماہنامہ الشریعہ)

انسانی حقوق کے حوالے سے اقوام متحدہ کی معاہداتی تنظیموں (CERD اور HRC) اور یورپی عدالتوں کے علاوہ فرانس، جرمنی، آسٹریا، اٹلی اور بعض دوسرے ممالک کی قانون ساز اسمبلیوں کے منظور شدہ قوانین نے ایک مخصوص فلسفہ قانون کو متشکل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان ممالک کے قوانین کی رو سے ''ہولوکاسٹ'' (ہٹلر کے ہاتھوں جرمنی میں مقیم یہودیوں کا قتل عام) سے انکار اور اسے خلاف واقعہ قرار دینا جرم ہے۔ (اس طرح اظہار رائے کی آزادی پر پابندی عائد کر کے اس حق کو محدود کر دیا گیا ہے) اندریں حالات پیغمبر اسلام سے نفرت (نعوذ باللہ) پر مبنی مواد یا تصاویر (کارٹونوں) کی اشاعت کا متعلقہ ممالک کی حکومتوں، قانون ساز اسمبلیوں اور عدالتوں نے نوٹس کیوں نہیں لیا؟ (بے نیازی، سرد مہری اور لاتعلقی) کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو عیسائیوں اور یہودیوں سے کمتر سمجھا جاتا ہے۔ کیا یہ امتیاز عدم مساوات کی نشاندہی نہیں کرتا؟

اگر اشتعال انگیز اور نفرت آمیز تصاویر کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے اور انہیں نظر انداز کر دیا جائے تو نتیجتاً انتہائی سنگین اور متشدد تنازعات جنم لے سکتے ہیں۔ گزشتہ ایک عشرے کے دوران میں روانڈا اور بوسنیا کے انکوائری کمیشنوں ہیگ اور اروشا میں ''جرائم کے عالمی ٹریبونلز'' نے کئی مفصل شواہد ریکارڈ کیے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نفرت پر مبنی خیالات و احساسات کا اظہار زبان سے کیا جائے یا تحریر سے یا تصویر کشی کا سہارا لیا جائے اور میڈیا ان خیالات اور احساسات کو پھیلانے اور عام کرنے میں بھرپور (مگر منفی) کردار ادا کرے تو ہم انہیں انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزی کی علامات قرار دے سکتے ہیں۔ اگر یورپی ممالک نے اپنے میڈیا

کے توسط سے کئے جانے والے نفرت کے اظہار کی روک تھام نہ کی تو مغربی اور اسلامی تہذیبوں کے تصادم کے جانبدارانہ اور متعصبانہ نظریات سچ ثابت ہو جائیں گے اور اسطرح ان نظریات کے داعی اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہریں گے، لہٰذا آزادی اظہار کے حق کا استعمال کرتے وقت ضروری ہے کہ اسے اخلاقی حدود و قیود میں رکھا جائے۔ یہی ''روشن خیال اعتدال پسندی'' کا اولین تقاضا ہے۔ عوامی مفاد کے پیش نظر بھی ایسا کرنا ضروری ہے۔

محولہ بالا فلسفہ ہائے قوانین کی روشنی میں یورپی ممالک میں موجودہ سماجی، فلاحی اور معاشرتی تنظیموں کو چاہئے کہ وہ ریاستی حکام، قانون ساز اسمبلی اور عدالتوں کی توجہ اس جانب مبذول کروائیں تاکہ یورپی یونین میں مقیم ڈیڑھ کروڑ مسلمان تارکین وطن توہین سے بچ جائیں اور ان کا مذہبی تقدس بھی مجروح نہ ہو۔ ڈنمارک کے وزیر اعظم راس مسن سے خصوصی درخواست کی جائے کہ وہ انسانی حقوق کے قوانین کے حوالے سے اپنے عالمی فرائض سے عہدہ برآ ہوں، امریکی اور برطانوی اخبارات نے ان کی دوبارہ اشاعت سے اجتناب برتنے کا جو عندیہ دیا ہے، وہ بھی خوش آئند ہے۔ یہ طرز عمل اسلامی دنیا کے مذہبی جذبات کے احترام کے مترادف ہے۔

مغرب میں بعض اوقات یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اسلامی اقدار مغرب کی معاشرتی اقدار سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں؟ ہاں! اساسی اعتبار سے دونوں ایک ہیں، لیکن دونوں میں بعض نمایاں اور واضح اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مغربی معاشرے میں شہریوں کو اظہار رائے کی مادر پدر آزادی حاصل ہے، وہ دوسروں کے عقائد کا جس طرح چاہیں، مضحکہ اڑا سکتے ہیں، لیکن اسلامی معاشروں میں اس چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

انسانی حقوق کے متعدد معاہدوں میں مسلمان ممالک فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شہری، سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے عالمی معاہدات، عورتوں کے ساتھ منفی امتیاز کے امتناع کا معاہدہ، ہر قسم کے نسلی امتیاز (تعصبات) کے خاتمہ کا عالمی معاہدہ، بچوں کے حقوق کا عالمی معاہدہ اور بعض دیگر معاہداتی دستاویزات کے ذریعے ''انسانی حقوق کے بین الاقوامی

اعلامیے'' کے پس پردہ کارفرما اصولوں کو قانونی ضوابط کا درجہ دے دیا گیا ہے، اسی طرح ریاستوں کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے انتظامی، قانونی اور تعزیری قوانین کے نفاذ میں بھی عالمی معیار کو پیش نظر رکھیں۔

یہ درست ہے کہ بعض ممالک ان دستاویزات کی کئی شقوں کے بارے میں تحفظات کا شکار ہیں۔ ان میں مغرب، ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ کے کچھ ممالک شامل ہیں۔ ان معیارات پر عمل درآمد کے وقت بعض ممالک اپنے فرائض کی کما حقہ ادائیگی سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ CERD یا HRC جیسے نگران اداروں اور یا پھر ان مانیٹرنگ کمیٹیوں کا کام ہے، جن کا انتخاب جغرافیائی اعتبار سے مساویانہ ہونا چاہئے۔

صرف یہ کہہ دینا اختلافات کو ہوا دینے اور سنگین تر کرنے کے مترادف ہے کہ دونوں تہذیبوں اور دونوں ثقافتوں میں ہم آہنگی کا فقدان کا ہے۔ اس نوعیت کے اظہار رائے میں اس مسئلے کا حل مضمر نہیں۔ مسلمان ریاستوں پر تنقید بے جا اور غیر حقیقت پسندانہ ہے کہ وہ مغربی اقدار سے مکمل سمجھوتہ نہیں کر رہیں۔ دو مختلف تہذیبوں کے ساتھ ان کی تاریخی وابستگی کو پیش نظر رکھا جائے تو مطالبہ احمقانہ نظر آئے گا۔ مثال کے طور پر اگر مغرب مسلمان ممالک سے یہ توقع کرے کہ وہ اظہار رائے کی آزادی کا ملا قبول کر لیں اور اس بات کو پیش نظر نہ رکھیں کہ وہ آزادی ان کے مذہبی شعور و احساس کو کتنے شدید دھچکوں سے دوچار کرتی ہے، حتی کہ وہ ایسی ہستیوں کی توہین بھی برداشت کر لیں جو ان کے نزدیک مقدس ترین اور حد درجہ قابل احترام ہیں تو ناقدین آگاہ رہیں کہ کوئی اسلامی ریاست اس نوعیت کی آزادی سے استفادہ نہیں کرے گی اور پھر مغربی معاشرت میں بھی اس قسم کی آزادی تضادات کا شکار ہے اور مغربی ممالک نے اس حوالے سے دوہرے معیار اپنا رکھے ہیں۔

اسلام کے خلاف دریدہ دہنی کے چیلنج سے نمٹنا مقصود ہے تو مسلمان دنیا کو چاہئے کہ اپنے جائز غم و غصے کو پرتشدد انداز میں ظاہر کرنے کی بجائے مغرب کے ساتھ دانشورانہ مباحث کی راہ اپنائے۔ مسلمانوں کی اپنے نبی ﷺ کے ساتھ وابستگی اور عقیدت کسی سے ڈھکی چھپی

ہر گز نہیں، جنہوں نے متعدد ستم اٹھائے، صعوبتیں برداشت کیں، لیکن اپنے نیک مقاصد کو ترک نہ کیا اور بالآخر مکہ میں ایک فاتح کے طور پر داخل ہوئے اور انتقام کی راہ سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ ایک عظیم الشان فاتح ہو کر بھی انہوں نے عفو درگزر کی ایسی مثال قائم کر دی جس کی ماضی قریب یا بعید میں کوئی نظیر دستیاب نہ تھی۔ لہٰذا امت مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ دلی، ذہنی اور جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے وقت ان کی سنت کو ترک نہ کریں اور اگر انتہائی غیر ذمہ دارانہ انداز میں توہین آمیز اور لڑنے مرنے پر اکسانے والے حملے کئے جائیں تو بھی وہ اپنی صفوں میں اتحاد اور نظم وضبط کی کمی نہ آنے دیں۔ (بشکریہ روزنامہ ''پاکستان'' لاہور اور ماہنامہ الشریعہ)

میڈیا کی جنگی یلغار بالفاظ قرآنی **والغوا فیہ لعلکم تغلبون** یا اردو محاورہ کے مطابق ''چور مچائے شور'' اپنی دہشت گردی وتعصبات کو چھپانے کے لئے قرآن، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یک طرفہ یلغار کر دی گئی۔ مغربی میڈیا نے عوام کے اندر صلیبی جنگ کے نعرہ کے مطابق ہیجان برپا کر دیا جس سے باہمی خدشات، تصادم اور خوف میں اضافہ ہوا لیکن جیسے جیسے وقت گذر رہا ہے پروپیگنڈہ کی دھول بیٹھ رہی ہے فریب اور طاقت کا پردہ فاش ہو رہا ہے مکالمہ کی ضرورت کا احساس فروغ پا رہا ہے تاکہ جانبین سے جس نے سمجھنے میں غلطی کی ہے اسے اس پر غور کرنا چاہئے، عیسائیت کے پیروکاروں کی جانب سے مکالمہ کی صدا بہت بلند آہنگ کے ساتھ تقریباً پچیس تیس سال سے بلند ہوتی رہی ہے لیکن احمد دیدات کے ہاتھوں متعدد صدمات سہنے کے بعد یہ صدا سکوت میں تبدیل ہو گئی ہے اور جہاں کہیں دوبارہ ظاہری کوشش کی جاتی ہے اس میں مسلمانوں کی جانب سے ایسے افراد کو نمائندگی کی دعوت دی جاتی ہے جن کا نام عربی یا مسلمانوں جیسا ہو وہ اس اسٹیج پر وہی کرتا ہے جو مداری کا بندر کرتا ہے ان کٹھ پتلیوں کے ذریعہ اپنی رواداری اور اسلام کی نمائندگی کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔

مکالمہ کسے کرنا چاہئے؟ اور کس کے درمیان ہونا چاہئے؟ اور کس موضوع یا پہلو پر ہونا چاہئے؟ یہ یقیناً قابل غور پہلو ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں حکومت کو مکالمے کے فروغ کے لئے فقط سرپرستی کرنی چاہئے اور یہ مکالمہ تمام مذاہب کے علماء و اسکالرز کے درمیان ہونا چاہئے اس لئے کہ علماء مذہب اور مسائل کا بہتر ادراک و شعور رکھتے ہیں۔

مکالمہ کے بے شمار پہلو ہیں مثلاً ملکی و معاشرتی مسائل کے حل میں لامذہبیت کا خاتمہ کرنا، مذہب کے اثر و رسوخ میں اضافہ کرنا، مذہبی بنیادوں پر ہونے والے تصادم کا خاتمہ کرنا۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں سب سے اہم مسئلہ دنیا میں امن کا قیام ہے جس کا ہر فرد ہر حکومت اور ہر مذہب کا پیروکار خواہاں ہے لیکن امن بذریعہ طاقت کا فلسفہ ناکام ہو چکا ہے لہٰذا امن بذریعہ مکالمہ بین المذاہب کی کوشش کی جانی چاہئے۔

۴ رمئی ۲۰۰۵ء کو صوبائی سیرت النبی کانفرنس کے موقع پر ہم نے اسی اہمیت کے پیش نظر ایک قومی سیرت کانفرنس ۲۰۰۶ء کا اعلان کیا تھا اور اسے شائع بھی کر دیا تھا جس کا عنوان تھا:

قومی سیرت النبی ﷺ کانفرنس ۲۰۰۶ء

بعنوان: عالمی مذاہب کے درمیان مکالمہ

باہمی خدشات، امکانات اور تصادم

اُسوہ انبیاء اور کتب مقدسہ کے تناظر میں

ہمیں خوشی ہے اس فکر کو سرکاری سطح پر بھی پذیرائی مل رہی ہے اور خود حکومت کی جانب سے بھی اس قسم کے پروگراموں کے انعقاد، ان کی اہمیت و ضرورت اور ان میں شرکت کے اعلانات سامنے آ رہے ہیں۔

روزنامہ جنگ ۱۴ راگست ۲۰۰۵ء کے مطابق صدر جنرل پرویز مشرف (ستمبر کے وسط) میں امریکہ میں یہودیوں کی عالمی کونسل کے صدر جیک روزین کی دعوت پر یہودیوں کے عالمی گروپ سے خطاب کیا۔

جنگ کراچی ۲۸ راگست ۲۰۰۵ء کے مطابق امریکہ میں پاکستانی سفیر جہانگیر کرامت نے کہا صدر کا خطاب مذاہب کے درمیان مکالمہ کی کڑی ہوگا۔

جنگ کراچی ۲۹ راگست ۲۰۰۵ء کے مطابق چودھری شجاعت نے تہذیبی تصادم کا حل پیش کرتے ہوئے فرمایا عیسائیت، اسلام اور یہودیت میں مکالمہ کرایا جائے۔ جنگ کراچی ۲۴ راگست ۲۰۰۵ء کی خبر کے مطابق کرسچن اسٹڈیز سینٹر کے تحت بھی اس حوالہ سے ایک سیمینار منعقد ہوا ہے جس کا عنوان تھا ''قیام امن کے لئے صحافیوں، وکلاء اور مذہبی لیڈروں کا کردار'' گو کہ مباحث کا علم نہیں ہو سکا لیکن یہ واضح ہے کہ مکالمہ کی ضرورت کا احساس تمام مذاہب میں موجود ہے لیکن یہ قومی کانفرنس جس کا ہم نے اعلان کیا ہے تنہا نہیں کر سکتے پورے ملک سے مختلف مذاہب کے اسکالرز کو جمع کرنا سفر و قیام کے اخراجات کے لئے ہمیں حکومت اور فکری ہم آہنگی رکھنے والوں سے تعاون کی درخواست ہے امید ہے اس کانفرنس کے ذریعہ نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی مذہبی رواداری اور اسلام کی اعلیٰ و جامع تعلیمات اجاگر ہوں گی۔

قرآن کا اکثر حصہ غیر مسلموں سے مکالمہ پر مشتمل ہے دو سو سے زائد غیر مسلم وفود سے آپ ﷺ نے مکالمہ کیا جس میں یہودی، عیسائی وغیرہ سب شامل ہیں، ضرورت ہے بامقصد و بامعنی مکالمہ کے ذریعہ اس سنت نبویہ ﷺ کو زندہ کیا جائے۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے غازی